



# دیوان غالب

از

میرزا اسد اللہ خان غالب

## غزلیات

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا؟ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا  
کاؤ کا و سخت جانہائے تنہائی، نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا  
جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا  
آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا  
بسکہ ہوں غالبِ اسیری میں بھی آتش زیر پا  
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا





جراحت تحفہ ، الماس ارمغان ، داغ جگر ہدیہ  
مبارک باد اسد ، غمخوار جان درد مند آیا



جز قیس اور کوئی نہ آیا بہ روئے کار  
آشفگی نے تنقش سویدا کیا درست  
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ  
لیتا ہوں مکتبِ غم دل میں سبق ہنوز  
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب برہنگی  
صحرا مگر بہ تنگی چشمِ حسود تھا  
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا  
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا  
لیکن یہی کہ رفت، گیا اور بود تھا  
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشے بغیر مرنے سکا کوہکن ، اسد!  
سر گشتہ خمارِ رسوم و قیود تھا



کہتے ہونہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا  
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا  
دوستدار دشمن ہے، اعتماد دل معلوم!  
سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری  
غنجہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل  
حال دل نہیں معلوم۔ لیکن اس قدر یعنی  
دل کہاں کہ گم کچے ہم نے مدعا پایا  
درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا  
آپ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا  
حسن و تغافل میں جرأت آزما پایا  
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا  
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا چاہا

شورِ پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا  
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا؟



دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا  
دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں  
میں عدم سے بھی پرے ہوں، رونہ غافل! بارہا  
عرض کچے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں؟  
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا  
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا  
میری آہ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا  
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا  
اس چراغاں کا کروں کیا، کارفرما جل گیا  
دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب! کہ دل  
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہل دنیا جل گیا



شوق ، ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا  
زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب  
بوئے گل ، نالہ دل ، دود چراغ محفل  
دل حسرت زدہ تھا ماندہ لذت درد  
اے نو آموز فنا ہمت دشوار پسند!

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا  
تیر بھی سینہ بسمل سے پر افشاں نکلا  
جو تری بزم نکلا سو پریشاں نکلا  
کام یاروں کا بہ قدر لب و دنداں نکلا  
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں بھر گریے نے اک شور اٹھایا غالب  
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا





دھمکی میں مر گیا جو، نہ باب نبرد تھا  
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا  
تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں  
دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب  
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی؟  
احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے  
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا  
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا  
مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا  
اس رنگور میں جلوہ گل آگے گرد تھا  
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا  
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے  
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا



شمارِ سبھ مرغوب بُت مشکل پسند آیا  
تماشائے بی یک کف بردن صد دل ، پسند آیا  
بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے  
کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل ، پسند آیا  
ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل  
کہ اندازے بہ خوں غلتیدن بسمل پسند آیا



دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا  
سبزہ خط خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا  
میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں  
دل گزرگاہ خیالِ مے و ساغر ہی سہی  
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی  
کس سے محرومی قسمت کی شکایت کہے

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا  
یہ زمر د بھی حریف دمِ انعی نہ ہوا  
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا  
گر نفسِ جاوہ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا  
گوشِ منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا  
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمہ یک جنبش لب سے غالب  
ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا



ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا  
بیان کیا کیجیے بیداد کاوش ہاے مژگاں کا  
نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کا  
دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے  
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے  
مری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورت خرابی کی  
اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر!

خمش میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں  
ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے  
بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ  
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا

وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا  
کہ ہر اک قطرہ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا  
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا  
مرا ہر داغ دل اک تخم؛ ہے سرو چراغاں کا  
کرے جو پرتو خورشید، عالم شہنمستاں کا  
ہیولی برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا  
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

چراغِ مردہ ہیں میں بے زباں، گورغریباں کا  
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا  
سبب کیا، خواب میں آ کر، تبسم ہاے پنہاں کا؟  
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا ، غالب

کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا



نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا  
حبابِ موجہٴ رفقار ہے نقشِ قدم میرا  
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے  
کہ موج بوائے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا



سراپا رہن عشق و ناگزیر الفتِ ہستی  
عبادتِ برق کی کرتا ہوں اور افسوسِ حاصل کا  
بقدرِ ظرف ہے ساقی ! خمارِ تشنہِ کامی بھی  
جو تو دریاے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا



محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہاے راز کا  
رنگ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے  
تو اور سوے غیر نظر ہاے تیز تیز  
صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا، وگرنہ میں  
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے  
کاوش کا، دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز

یاں ورنہ جو حجاب ہے۔ پردہ ہے ساز کا  
یہ وقت ہے شگفتن گل ہاے ناز کا  
میں اور دکھ تری مژہ ہاے دراز کا  
ظعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا  
ہر گوشہ بسا ہے سر شیشہ باز کا  
ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غم ہجراں ہوا ، اسدا!

سینہ کہ تھا دہینہ گہر ہاے راز کا



رکھو یارب یہ درِ گنجینہ گوہر کھلا  
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا  
آستین میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا  
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا  
خلد کا اک در میری گور کے اندر کھلا  
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا  
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا  
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا  
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا  
شب ہوئی، پھر انجمِ رخسندہ کا منظر کھلا  
گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب  
کو نہ سمجھوں اس کی باتیں، کو نہ پاؤں اس کا بھید  
ہے خیالِ حسن میں، حسنِ عمل کا سا خیال  
منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں  
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا  
کیوں اندھیری ہے شبِ غم، ہے بلاؤں کا نزول  
کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال

اس کی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند  
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا





شب کہ برق سوزِ دل سے زہرہ ابر آب تھا  
واں کرم کو عذر بارش تھا عنان گیر خرام  
واں خود آرائی کو تھا موتی پر و نونے کا خیال  
جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو،  
یاں سر پر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو،  
یاں نفس کرتا تھا روشن، شمع بزم بجنودی  
فرش سے تاعرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا  
شعلہ جوالہ ہر اک حلقہ گرداب تھا  
گریے سے یاں پنبہ بالش کف سیلاب تھا  
یاں ہجوم اشک میں تار نگہ نایاب تھا  
یاں رواں مژگاں چشم تر سے خون ناب تھا  
واں وہ فرقِ نازِ محو بالش کنو اب تھا  
جلوہ گل واں بساطِ صحبت احباب تھا  
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونناہہ ٹپکانے لگا  
دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا



نالہٴ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا  
مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے  
تھا سپند بزمِ وصلِ غیر، گو بیت تاب تھا  
خانہٴ عاشق، مگر سازِ صداے آب تھا  
پہلوے اندیشہ وقف بسترِ سنجاب تھا  
پہلوے اندیشہ وقف بسترِ سنجاب تھا  
ذره ذرہ روکش خورشیدِ عالمتاب تھا  
ذره ذرہ روکش خورشیدِ عالمتاب تھا  
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا  
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا  
تظارِ صید میں اک دیدہٴ بے خواب تھا  
تظارِ صید میں اک دیدہٴ بے خواب تھا

میں نے روکا راتِ غالب کو ، وگرنہ دیکھتے  
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کھنکھ سیلاب تھا



ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب  
اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو  
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا  
توڑا جو نے آئینہ ، تمثالِ دار تھا  
جلیوں میں میری نعلش کو کھینچے پھرو، کہ میں  
جاں دادہ ہواے سرِ رنگوار تھا  
موجِ سراپِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال  
ہر ذرہ ، مثلِ جوہرِ تیغ ، آبِ دار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو ، پر اب  
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا



بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا  
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی  
واے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھے کو  
جلوہ ، از بسکہ تقاضاے نگہ کرتا ہے  
عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ  
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمناے نشاط  
عشرت پارۂ دل ، زخمِ تمنا کھانا  
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا  
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا  
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا  
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مرگاں ہونا  
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا  
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا  
لذت ریشِ جگر ، غرقِ نمکداں ہونا  
ہاے اس زود پشیاں کا پشیاں ہونا

حیف اس چارہ گرہ کپڑے کی قسمت غالب!  
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا



شب خمار شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا  
تا محیطِ بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا  
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا  
جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا  
مانع وحشتِ خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟  
خانہ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا  
پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن  
دست مرہونِ حنا، رخسارِ رہن گزارہ تھا

نالہٴ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد  
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا



دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا  
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور، کب تلک  
حضرت ناصح گرا آئیں، دیدہ و دل فرشِ راہ  
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جانا ہوں میں  
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھایوں سہی  
خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا  
ہم کہیں گے حال دل، اور آپ فرمائیں گے کیا  
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا  
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا  
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا  
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفتِ اسد  
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟



اور اگر جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا  
کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا؟  
کبھی تو نہ توڑ سکتا ، اگر استوار ہوتا  
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا  
کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی نمگسار ہوتا  
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا  
غم عشق گر نہ ہوتا ، غم روزگار ہوتا  
مجھے برا تھا مرنا ، اگر ایک بار ہوتا  
نہ کبھی جنازہ اٹھتے ، نہ کہیں مزار ہوتا  
جو دوئی کی بوبھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائل تصوف ، یہ ترا بیان غالب  
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا  
ترے وعدے پر جیسے ہم تو یہ جان جھوٹا جانا  
تری ناز کی ہے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا  
کوئی میرے دل سے پوچھے ، ترے تیر نمکش کو  
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح  
رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا  
غم اگر چہ جاں گسل ہے ، پہ بچپن کہاں کہ دل ہے!  
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے ، شب غم بری بلا ہے  
ہوے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا  
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا



ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا  
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا  
نواز شہاے بیجا دیکھتا ہوں  
نگاہ بے محابا چاہتا ہوں  
فروغِ شعلہٴ خس یک نفس ہے  
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے  
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے  
دل ہر قطرہ ہے سازِ ”انا لبحر“  
محابا کیا ہے ، میں ضامن ادھر دیکھ  
سن اے غارت گر جنسِ وفا ، سن  
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟  
یہ قاتل وعدہٴ صبر آزما کیوں؟  
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا  
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا؟  
شکایت ہاے رنگیں کا گلا کیا  
تغافل ہاے تمکین آزما کیا  
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا  
تغافل ہاے ساقی کا گلا کیا  
غم آوارگی ہاے صبا کیا  
ہم اس کے ہیں ، ہمارا پوچھنا کیا  
شہیدانِ نگہ کا خونہا کیا  
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا  
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا  
یہ کافرِ فتنہٴ طاقت رُبا کیا؟

بلاے جاں ہے غالبِ اس کی ہر بات  
عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا؟





درخویرِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا  
بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں، کہ ہم  
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا  
کم نہیں نازشِ ہمنامی چشمِ خوباں  
سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا  
نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا  
ہر بن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خونباب  
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل

پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا  
اٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا  
روبرو، کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا  
تیرا بیمار، برا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا  
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا  
کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا  
حزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا  
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہٴ پینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے  
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا



اسد ہم وہ جنوں جولاں گداے بے سرو پا ہیں کہ ہے سرہنجیہ مشگانِ آہو پشت خارا پنا



پے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا  
نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا  
زکاتِ حسن دے، اے جلوۂ بینش، کہ مہر آسا  
نہ مارا جان کر بے جرم عاقل! تیری گردن پر  
تمناے زباں محو سپاس بے زبانی کا  
وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے  
دہان ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی

بہ خون غلتیدہ صدرنگ دعویٰ پارسائی کا  
بہ مہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا  
چراغ خانہ درویش ہو کا سہ گدائی کا  
رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا  
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا  
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا  
عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

نے دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے  
کہ حسرت سنج ہوں عرض ستم ہاے جدائی کا



درد منت کش دوا نہ ہوا  
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو  
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں  
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب  
ہے خبر گرم ان کے آنے کی  
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟  
جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی  
زخم گر دب گیا ، لہو نہ تھا  
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے؟

میں نہ اچھا ہوا ، برا نہ ہوا  
اک تماشا ہوا ، گلا نہ ہوا  
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا  
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا  
آج ہی گھر میں بوریہ نہ ہوا  
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا  
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا  
کام گر رک گیا روا نہ ہوا  
لے کے دل ، دلستانی روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں  
آج غالب غزل سرا نہ ہوا



گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا  
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پانچ مکتوب  
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی  
غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو  
ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں  
دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے  
نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدار حسرت دل ہے

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا  
مگر ستمزدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا  
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا  
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا  
کرے ہے ہر بن مو، کام چشم پینا کا  
ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا  
مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسد  
جنا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا



قطرہ مے بسکہ حیرت نفس پرور ہوا  
خط جام مے سراسر، رشتہ گوہر ہوا  
اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا  
غیر نے کی آہ ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا



جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا      تپش شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا  
اہل بینش نے بہ حیرت کدہ شوخی ناز      جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا  
یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا      عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا

نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضمون ، غالب

گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا



گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا  
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا  
تنگی دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے  
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا  
بعد یک عمر درع بار تو دیتا بارے  
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا





نہ تھا کچھ تو خدا تھا ، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا  
ڈبویا مجھ کو ہونے نے ، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا  
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا  
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا  
ہوئی مدت کہ غالب مر گیا ، پر یاد آتا ہے  
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا



یک ذرہ زمیں نہیں بیکار باغ کا  
بے مے کے ہے طاقت آشوب آگہی  
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل  
تازہ نہیں ہے نشہ فکر سخن مجھے  
سو بار بند عشق سے آذاد ہم ہوئے  
بے خون دل ہے چشم میں موج نگہ غبار

باغ شگفتہ تیرا بساط نشاط دل  
ابر بہار خمکدہ کس کے دماغ کا!



وہ مری چینِ جبیں سے غم پنہاں سمجھا  
یک الف پیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز  
شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ  
بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام  
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا  
سفر عشق میں ضعف نے راحت طلبی  
تھا گریزاں مژدہ یار سے دل تادمِ مرگ

راز مکتوب بہ بے ربطی عنوان سمجھا  
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریبان سمجھا  
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا  
رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا  
نبضِ خس سے تپشِ شعلہ سوزاں سمجھا  
ہر قدم سارے کو میں اپنے شبتاں سمجھا  
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار ، اسد  
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا



پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا      دل ، جگر تشنہ فریاد آیا  
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز      پھر ترا وقت سفر یاد آیا  
سادگی ہائے تمنا ، یعنی      پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا  
عذر و اماندگی ، اے حسرت دل !      نالہ کرتا تھا ، جگر یاد آیا  
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی      کیوں ترا راہگور یاد آیا  
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی      گھر ترا خلد میں گر یاد آیا  
آہ وہ جرأت فریاد کہاں      دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا  
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال      دل گم گشتہ ، مگر ، یاد آیا  
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے !      دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا  
میں مجنوں پہ      لڑکپن میں اسد  
سنگ اٹھایا تھا      کہ سر یاد آیا



ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا  
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ  
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں؟  
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد  
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟  
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی  
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا  
پیشے میں عیب نہیں، رکھے نہ فرہاد کو نام  
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی  
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق  
آپ آتے تھے، مگر کوئی عنایاں گیر بھی تھا  
اس میں کچھ شاہدِ خوبی تقدیر بھی تھا  
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نچیر بھی تھا  
ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا  
بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقدیر بھی تھا  
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا  
نالہ کرتا تھا، ولے طالب تاثیر بھی تھا  
ہم ہی آشفقتہ سروں میں وہ جوانمیر بھی تھا  
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا  
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا  
رتختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب  
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا



لب خشک در تشنگی مردگان کا  
زیارت کدہ ہوں دل آزردهاں کا  
ہمہ ناامیدی ، ہمہ بدگمانی  
میں دل ہوں فریب وفا خوردگان کا



تو دوست کسی کا بھی ، ستمگر ! نہ ہوا تھا  
چھوڑا مہِ نخب کی طرح دستِ قضا نے  
توفیق بہ اندازہٴ ہمت ہے ازل سے  
جب تک نہ دیکھا تھا قیدِ یار کا عالم  
میں سادہ دل ، آزر دگی یار سے خوش ہوں  
دریاے معاصی تک آبی سے ہوا خشک  
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا  
خورشیدِ ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا  
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا  
میں معتقدِ فتنہٴ محشر نہ ہوا تھا  
یعنی سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا  
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی آسِ داغِ جگر سے مرے تحصیل

آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا



شب کہ وہ مجلسِ فروزِ خلوتِ ناموس تھا  
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا  
رشتہٴ ہو شمعِ خارِ کسوتِ فانوس تھا  
کس قدر یاربِ ہلاکِ حسرتِ پا بوس تھا  
دل بہ دل پیوستہ، گویا، یک لبِ افسوس تھا  
حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو

کیا کروں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں  
جو کہ کھایا خونِ دل ، بے منت کی موس تھا





آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے  
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا  
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے  
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا



عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا  
جاتا ہوں داغِ حسرت ہستی لیے ہوئے  
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں  
بر روے شش جہت در آئینہ باز ہے  
وا، کر دیے ہیں شوق نے بند نقابِ حسن  
گو میں رہا رہینِ ستم ہاے روزگار  
دل سے ہوائے کشتِ وفامٹ گئی کہواں  
جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا  
ہوں شمع کشتہ ، درخور محفل نہیں رہا  
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا  
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا  
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا  
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا  
حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

بیدارِ عشق سے نہیں ڈرتا ، مگر اسد!

جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا



رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف  
ذره ذره ساغرِ مے خانہ نیرنگ ہے  
شوق ہے ساماں طرازِ نازش اربابِ عجز  
میں اور اک آفت کا کلڑا، وہ دل وحشی کہ ہے  
شکوہ سنج رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے  
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا  
گردش مجنوں بہ چشمکھائے لیلی آشنا  
ذره ، صحرا دستگاہ و قطرہ ، دریا آشنا  
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا  
میرا زانوِ مونس اور آئینہ تیرا آشنا

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا ، اسد

سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا



بن گیا رقیب آخر ، تھا جو راز داں اپنا  
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا  
عرش سے ادھر ہوتا ، کاشکے ، مکاں اپنا  
بارے آشنا نکلا ، ان کا پاسباں ، اپنا  
انگلیاں فگار اپنی ، خامہ خونچکاں اپنا  
تنگِ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا  
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا  
مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب  
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے  
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے  
درِ ودل لکھوں کب تک ، جاؤں ان کو دکھلا دوں  
گھتے گھتے مٹ جاتا ، آپ نے عبث بدلا  
تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے  
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا



سرمہٗ مفت نظر ہوں ، مری قیمت یہ ہے  
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا  
رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم  
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا



غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں  
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ  
بے شانہ صبا نہیں طرہ گیہاہ کا  
صیدِ ز دام جتہ ہے اس رامگاہ کا  
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا  
پر گل خیالِ زخم سے دامنِ نگاہ کا  
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے

جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسد  
پروانہ ہے وکیلِ ترے دادِ خواہ کا



جور سے باز آئے ، پر باز آئیں کیا  
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں  
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ  
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ  
موج خوں سر سے گزر رہی کیوں نہ جائے  
عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ

کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا  
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا  
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا  
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟  
آستیا یار سے اٹھ جائیں کیا؟  
مر گئے پر ، دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے  
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا



لطف بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی  
چمن ز نگار ہے آئینہ بار بہاری کا  
حریف جوش دریا نہیں خود داری ساحل  
جہاں ساقی ہو تو ، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا





عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا  
تجھ سے، قسمت میں مری صورت قفل ابجد  
دل ہو کشمکش چارہ زحمت میں تمام  
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ  
ضعف سے گر یہ مبدل بہ دم سرد ہوا  
دل سے ثنا تری انگشتِ حنائی کا خیال  
ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلنا  
گر نہیں نکہت گل کو ترے کوچے کی ہوس  
تا کہ تجھ پر کھلے اعجاز ہواے صیقل

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا  
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا  
مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا  
اس قدر دشمن اربابِ وفا ہو جانا  
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا  
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا  
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا  
کیوں ہے گر درہ جولان صبا ہو جانا  
دیکھ برسات میں سبز آنے کا ہو جانا

بخشنے ہے جلوۂ گل ، ذوق تماشا غالب  
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا



دے بٹ مے کو دل و دست شنا موج شراب  
سایہ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب  
سر سے گزرے پہ بھی ہے بال ہا موج شراب  
موج ہستی کو کرے فیض ہوا موج شراب  
موج گل موج شفق موج صب، موج شراب  
دے ہے تسلیں بہ دم آب بقا موج شراب  
شہپر رنگ سے ہے باک کشا موج شراب  
ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موج شراب  
بسکہ رکھتی ہے سر نشو و نما موج شراب  
موجہ سبزہ نوخیز سے تا موج شراب  
رہبر قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موج شراب

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب  
پوچھ مت وجہ یہ مستی ارباب چمن  
جو ہوا غرقہ مے بخت رسا رکھتا ہے  
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر  
بار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو،  
جس قدر روح نباتی ہے جگر تشنہ ناز  
بسکہ دوڑے ہے رگ تاک میں خوں ہو ہو کر  
موجہ گل سے چراغاں ہے گزر گاہ خیال  
نشے کے پردے میں ہے مجو تماشاے دماغ  
ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیت فصل  
شرح ہنگامہ ہستی ہے ز ہے موسم گل!

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھ ، اسد

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب



افسوس کہ دنیاں کا کیا رزق فلک نے  
جن لوگوں کی تھی درخور عقد گہر انگشت  
کافی ہے نشانی ہے تری ، چھلے کا نہ دینا  
خالی مجھے دکھلا کے بہ وقت سفر انگشت  
لکھتا ہوں اسد سوزش دل سے سخن گرم  
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت



رہا گر کوئی تا قیامت سلامت  
جگر کو مرے ، عشق خونباہ مشرب  
علی الرغم دشمن شہید وفا ہوں  
نہیں گر سر و برگِ ادراک معنی  
تماشاے نیرنگِ صورت سلامت



مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب  
یار لائے مری بالیں پہ اسے ، پر کس وقت



دو دِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست  
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست  
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتارِ دوست  
کشتہ دشمن ہوں آخر، گر چہ تھا بیمارِ دوست  
دیدۂ پر خوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست  
اے دل نا عاقبت اندیش ضبطِ شوق کر  
خانہ ویراں سازی حیرت تماشا کیجیے  
عشق میں بیدارِ شک غیر نے مارا مجھے  
چشمِ ماروِشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے

## ق

غیر یوں کرتا ہے میری پرستش اس کے ہجر میں  
تا کہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک  
جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعف دماغ  
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر  
مہربانی ہاے دشمن کی شکایت کیجیے؟  
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست  
مجھ کو دیتا ہے پیام وعدہ دیدار دوست  
سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست  
ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست  
یا بیان کچے سپاس لذت آزار دوست؟

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ  
ہے ردیف شعر میں غالب ز بس تکرار دوست



گلشن میں بندوبست بہ رنگ دگر ہے آج  
قمری کا طوق حلقہٴ بیرونِ در ہے آج  
آتا ہے ایک پارہٴ دل ہر فغان کے ساتھ  
تارِ نفسِ کمنہٴ شکارِ اثر ہے آج  
اے عافیت کنارہ کر ، اے انتظام چل  
سیلابِ گریہ در پے دیوار و در ہے آج





لو ہم مریض عشق کے بیمار دار ہیں  
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج!



نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ  
کمال گرمی سعی تلاش دید نہ پوچھ  
تجھے بہانہ راحت ہے انتظار اے دل  
تری طرف ہے، بہ حسرت، نظارہ نرگس  
بہ نیم غمزہ ادا کر حق و دیعت ناز  
اگر شراب نہیں، انتظار ساغر کھینچ  
بہ رنگ خار مرے آنے سے جوہر کھینچ  
کیا ہے کس نے اشارہ کہ ناز بستر کھینچ  
بہ کوری دل و چشم رقیب ساغر کھینچ  
نیام پردہ زخم جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتش پنہاں  
بہ روے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ



بارے، آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد  
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد  
شعلہٴ عشق سپہ پوش ہوا میرے بعد  
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد  
نگہٴ ناز ہے سرے سے خفا میرے بعد  
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد  
ہے مکرر لب ساقی میں صلا میرے بعد  
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب  
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد  
منصبِ شیفنگی کے کوئی قابل نہیں رہا  
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے  
خوں ہے دل، خاک میں احوال بتاں پر یعنی  
درخور عرس نہیں جوہر بیداد کو جا  
ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوش وداع  
کون ہوتا ہے حریف مرے مردانگن عشق  
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی



بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار  
و نور اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ  
نہیں ہے سایہ، کہ سن کر نوید مقدم یار  
ہوئی کس قدر ارزانی مے جلوہ  
جو ہے تجھے سر سوداے انتظار تو آ  
ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے  
وہ آ رہا مرے ہمسائے میں، تو سائے سے  
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے، گھر کی آبادی  
نہ پوچھ بے خودی عیش مقدم سیلاب

نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار  
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار  
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار  
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار  
کہ ہیں دکان متاع نظر در و دیوار  
کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر در و دیوار  
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار  
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار  
کہ ناچتے ہیں پڑے، سر بسر، در و دیوار

نہ کہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں

حریف رازِ محبت ، مگر در و دیوار



گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر  
کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقت سخن  
کام اس سے آپڑا ہے کہ جس کا جہان میں  
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگر نہ ہم  
چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا  
مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام  
ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو  
بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہوا التفات

جانے گا اب بھی تو، نہ مرا گھر کہے بغیر؟  
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر؟  
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر  
سر جائے یار ہے، نہ رہیں پر کہے بغیر  
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر  
چلتا نہیں ہے دشمن و خنجر کہے بغیر  
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر  
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض

ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر



کیوں جل گیا نہ تاب رخ یاد دیکھ کر  
آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے  
کیا آبروے عشق جہاں عام ہو جفا  
آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے  
ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خونِ خلق  
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ  
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ  
زنار باندھ ، سجہ صد دانہ توڑ ڈال  
ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں  
کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے  
گرنی تھی ہم پہ برق تجلی ، نہ طور پر

جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر  
سرگرم نالہ ہاے شرر بار دیکھ کر  
رکتا ہوں ، تم کو بے سبب آزاد دیکھ کر  
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر  
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر  
ہم کو حریص لذتِ آزاد دیکھ کر  
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر  
رہو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر  
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر  
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر  
دیتے ہیں بادۂ ظرف قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا  
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر



میں ہوں وہ قطرہ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر  
سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر  
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر  
بہم گر صلح کرتے پارہ ہاے دل نمکداں پر  
کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہرِ عنوان پر  
کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر  
قیامت اک ہواے تند ہے خاک شہیداں پر

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہرِ درخشاں پر  
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی  
فنا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زمانے سے  
فراغت کسی قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے  
نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا  
مجھے اب، دیکھ کر ابر شفق آلودہ، یاد آیا  
بجز پروازِ شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا

نہ لڑنا ناصح سے غالب کیا ہوا اگر اس نے شدت کی؟  
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر!



کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور  
دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھے کوزباں اور  
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور  
لے آئیں گے بازار سے، جا کر دل و جاں اور  
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور  
ہوتے جو کئی دیدہ خونباہ فشاں اور  
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ”ہاں اور“  
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور  
کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور  
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہے بسکہ ہراک ان کے اشارے میں نشاں اور  
یارب وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مرے بات  
ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند  
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے  
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں  
ہے خون جگر جوش میں، دل کھول کے روتا  
مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سراڑ جائے  
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا  
لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین  
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے  
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور





صفاے حیرت آئینہ ہے سامان زنگِ آخر  
تغیر آبِ بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگِ آخر  
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیرِ وحشت کی  
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگِ آخر



جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہونہ عریانی  
بہ رنگ کاغذ آتش زدہ ، نیرنگ بیتابی  
فلک سے ہم عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے  
ہم اور وہ بے سبب رنج، آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے  
فنا کو سو نپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا  
گر یہاں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر  
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک پیدن پر  
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہن پر  
شعاع مہر سے تہمت نگہ کی چشم زوزن پر  
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسد بمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے  
”تو مشق ناز کر ، خون دو عالم میری گردن پر“



ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خواہاں تجھ پہ عاشق ہیں  
تکلف بر طرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر



لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور  
مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا  
آئے ہوکل، اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں  
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے  
ہاں اے فلک پیر، جواں تھا ابھی عارف  
تم ماہ شب چار دھم تھے مرے گھر کے  
تم کون سے تھے ایسے کھرے داد دستد کے!  
مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی  
گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش

تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور  
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور  
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور  
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور  
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور  
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور  
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور  
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور  
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب  
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور



فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر  
ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز  
ہے ناز مفلسان زیر از دست رفتہ پر  
ہوں گل فروش شوخی داغ کہن ہنوز  
مے خانہ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں  
خمیازہ کھینچے ہے بت بیداد فن ہنوز



حریف مطلب مشکل نہیں فسوں نیاز دعا قبول ہو یا رب ، کہ عمر خضر دراز  
نہ ہو بہ ہرزہ ، بیاباں نورد وہم وجود ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز  
وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں کہ دیجئے آئینہ انتظار کو پرواز  
ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست گئی نہ خاک ہوے پر ہوائے جلوہ ناز

نہ پوچھ وسعت مے خانہ جنوں غالب  
جہاں یہ کاسہ گردوں ہے ایک خاک انداز



وسعت سعی کرم دیکھ کر سر تا سر خاک  
گزرے ہے آبلہ پا ابر گھر بار ہنوز  
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحہٴ دشت  
نقش پا میں ہے تپ گرمی رفتار ہنوز



کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز  
دل سے نکلا ، پہ نہ نکلا دل سے ہے ترے تیر کا پیکان عزیز  
تاب لائے ہی بنے گی غالب  
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز





نہ گل نغمہ ہوں، نہ پردہ ساز  
تو اور آرایش خم کا گل  
لافِ تمکلیں ، فریبِ سادہ دلی  
ہوں گرفتار الفتِ صیاد  
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے  
نہیں دل میں مرے وہ قطرہ خوں  
اے ترا غمزہ ، یک قلم انگیز  
تو ہوا جلوہ گر ، مبارک ہو  
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا  
میں ہوں اپنی شکست کی آواز  
میں اور اندیشہ ہاے دور دراز  
ہم ہیں اور راز ہاے سینہ گداز  
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز  
ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز  
جس سے مرگاں ہوئینہ ہو گل باز  
اے ترا ظلم ، سر بسر انداز  
ریشِ سجدہٗ جبینِ نیاز  
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا  
اے دریغا! وہ رند شاہد باز



دام خالی قفس مرغ گرفتار کے پاس  
جوئے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے پاس  
خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس  
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس  
نہ کھڑے ہو جیسے خو، بان دل کے آزار کے پاس  
خود بخود پنچے ہے گل گوشہ دستار کے پاس

مژدہ، اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے  
جگر تشنہ آزاد تسلی نہ ہوا  
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!  
میں بھی رک رک کے نہ مرنا، جونباں کے بدلے  
دہن شیریں میں جا بیٹھیے لیکن اے دل  
دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ نمو، کرتا ہے

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی، ہے ہے !  
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس



نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزہ خط سے  
لگاوے خانہ آئینہ میں روے نگارِ آتش  
فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق  
نہ نکلے شمع کے پا سے ، نکالے گر نہ خارِ آتش



جادہ راہ خور کو وقت شام ہے تارِ شعاع  
چرخِ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع



رخ نگار سے ہے سوزِ جاودانی شمع  
زبانِ اہل زباں میں ہے مرگِ خاموشی  
کرے ہے صرف بہ ایماے شعلہ، قصہ تمام  
غم اس کو حسرت پر وانہ کا ہے اے شعلہ!  
ترے خیال سے روح اہتراز کرتی ہے  
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ  
ہوئی ہے آتش گل، آبِ زندگانی شمع  
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع  
بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانی شمع  
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع  
بہ جلوہ ریزی باد و بہ پر فشانی شمع  
شگفتگی ہے شہید گلِ خزانی شمع

جلے ہے دیکھ کے بالین یار پر مجھ کو  
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانی شمع



بیم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش  
مجبور ، یاں تلک ہوے اے اختیار حیف  
جتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم ایک بار جل گئے  
اے ناتمامی نفس شعلہ بار حیف



زخم پر چھڑکیں کہاں طفلان بے پروا نمک  
گردِ راہ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل  
مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو  
شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج  
داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ  
چھوڑ کر جاناتنِ مجروح عاشق، حیف ہے  
غیر کی منت نہ کھینچوں گا پے توفیرِ درد  
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک  
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک  
نالہٴ بلبل کا درد اور خندہٴ گل کا نمک  
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجہٴ دریا نمک  
یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک  
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک  
زخمِ مثلِ خندہٴ قاتل ہے سر تا پا نمک

یاد ہیں غالبِ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں  
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک



کون جیتتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک  
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک  
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک  
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک  
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک  
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک  
دام ہر موج میں ہے حلقہٴ مہد کام نہنگ  
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب  
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن  
پرتو خور سے ہے شبِ بنم کو فنا کی تعلیم  
یک نظر پیش نہیں فرصتِ ہستی، غافل

غمِ ہستی کا آسہ کس سے ہو جز مرگ علاج  
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک





گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ  
یعنی بغیر یکِ دلِ بے مدعا نہ مانگ  
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد  
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ



ہے کس ہلاک فریب و فائے گل  
آزادی نسیم مبارک کہ ہر طرف  
جو تھا سو موج رنگ کے دھوکے میں مر گیا  
خوش حال اس حریف یہ مست کا کہ جو  
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار  
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے باد بہار سے  
سطوت سے تیرے جلوہ حسنِ غیور کی  
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل  
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دامِ ہوائے گل  
اے واے نالہ لبِ خونیں نوائے گل  
رکھتا ہو مثلِ سایہ گل سر بہ پائے گل  
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل  
میناے بے شراب و دل بے ہوائے گل  
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل  
بے اختیار دوڑے ہے گل درقنائے گل

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو  
جس کا خیال ہے گل جیب قبائے گل



غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس  
مخفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال  
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم  
ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بت خانہ ہم  
ہیں چراغانِ شبستانِ دل پروانہ ہم  
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمت مردانہ ہم  
باوجود یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں  
ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترک جستجو

دائم الحسب اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد  
جانتے ہیں سینہ پر خوں کو زنداں خانہ ہم



بہ نالہ حاصلِ دل بے تگی فراہم کر  
متاع خانہ زنجیر ، جز صدا، معلوم!



مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور  
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم  
وہ حلقہ ہائے زلف کہیں میں ہیں اے خدا  
رکھ لیچو میرے دعویٰ وارتگی کی شرم



لوں وام بخت خفتہ سے یک خواب خوش ولے  
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں



وہ فراق اور وہ وصال کہاں  
فرصت کاروبار شوق کے  
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا  
تھی وہ اک شخص کے تصور سے  
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں  
ذوق نظارۂ جمال کہاں  
شورِ سوداے خط و خال کہاں  
اب و ہ رعنائی خیال کہاں  
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں  
واں جو جاویں، گرہ میں مال کہاں  
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضحل ہو گئے قوی غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں



کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں  
آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے  
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو  
دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے  
ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود  
پاے افکار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے  
اک شرر دل میں ہے، اس سے کوئی گھبرائے گا کیا  
دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ  
اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفۃ اب مرثیہ کہویں شاید  
مر گیا غالب آشفۃ نوا ، کہتے ہیں





ہے گریبان تنگ پیراہن جو دامن میں نہیں  
رنگ ہو کراڑ گیا، جو خوں کے دامن میں نہیں  
ذڑے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں  
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں  
انجمن بے شمع ہے، گر برقِ خرمن میں نہیں  
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں  
جلوہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں  
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں  
موج مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں  
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

آبرو کیا خاک اس گل کی گلشن میں نہیں  
ضعف سے اے گر یہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں  
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہ آفتاب  
کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے  
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے  
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن  
بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے  
قطرہ قطرہ اک ہیولی ہے نئے نئے ناسور کا  
لے گئی ساتی کی نخوتِ قلزمِ آشامی مری  
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر  
بے تکلف ہوں وہ مشیتِ خس کہ گلخن میں نہیں



عہدے سے مدح ناز کے ، باہر نہ آسکا      گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں  
حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بہ سوئے دل      ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں  
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش      تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ  
ہے ہے ! خدا نہ کردہ ، تجھے بیوفا کہوں



مہرباں ہو کے بلا لو مجھے ، چاہو جس وقت  
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں  
ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے  
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں  
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ، ستمگر ! ورنہ  
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں؟



ہم سے کھل جاؤ بے وقت مے پرستی ایک دن  
غمرہ اوج بناے عالم امکاں نہ ہو  
ورنہ ہم چھڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن  
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن  
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن  
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن  
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانے

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں  
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن



ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں  
کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا  
ہم کو ستمِ عزیز ، ستمگر کو ہم عزیز  
بوسہ نہیں ، نہ دیکھیے دشنام ہی سہی  
ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے  
جانِ مطربِ ترانہِ ہل من مزید ہے  
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم  
ہے نگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو  
نقصاں نہیں جنوں میں ، بلا سے ہو گھر خراب  
کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں  
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی  
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں  
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں  
نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں عزیز  
آخر زبان تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں  
ہر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں  
لب پر وہ سنج زمزمہ الاماں نہیں  
دل میں چھری چھو، مژہ گر خونچکاں نہیں  
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں  
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں  
گویا جبیں پہ سجدہٴ بت کا نشاں نہیں  
روح القدس اگر چہ مرا ہمزباں نہیں

جاں ہے بہاے بوسے ولے کیوں کہے ابھی  
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں



مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں  
شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں  
حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے  
رنگ نومیدی جاوید؛ گوارا رہو  
سر کھجاتا ہے جہان زخم سراچھا ہو جائے  
جب کرم رخصت بیباکی و گستاخی دے

ایک چکر ہے مرے پانو میں، زنجیر نہیں  
جادہ غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں  
جادہ راہ وفا جز دم شمشیر نہیں  
خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں  
لذت سنگ بہ اندازہ تقریر نہیں  
کوئی تفسیر بجز نخلت تفسیر نہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ  
”آپ بے بہرہ ہے، جو معتقد میر نہیں“



مت مردُک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں  
ہیں جمع سوید اے دل چشم میں آہیں



بر شڪالِ گريهٔ عاشقِ ہے ، ديكھا چا ہے  
كھل گئی مانند گلِ سو جا سے ديوارِ چمن  
الفٽِ گلِ سے غلطِ ہے دعوىِ وارنگى  
سردِ ہے با وصفِ آزادىِ گرفتارِ چمن





عشق تا شیر سے نومید نہیں جاں سپاری شجر بید نہیں  
سلطنت دست بہ دست آئی ہے جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں  
ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پرتو خورشید نہیں  
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں  
گردش رنگِ طرب سے ڈر ہے غمِ محرومی جاوید نہیں  
کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ  
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں



جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں  
دلِ آشفٹگاں خالی کنجِ دہن کے  
ترے سروِ قامت سے اک قد آدم  
تماشا ! کہ اے محورِ آئینہ داری  
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں  
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں  
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں  
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں  
کہ شہرو کا نقش قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب  
تماشاے اہل کرم دیکھتے ہیں



کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں  
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں  
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خراب میں  
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں  
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں  
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں  
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں  
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں  
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں  
لاکھوں بناو، ایک بگڑنا عتاب میں

ملتی ہے خوے یار سے نار التہاب میں  
کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں  
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر  
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں  
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام  
جو منکرِ وفا ہو، فریب اس پہ کیا چلے  
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے  
میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے  
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے  
لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا

## ق

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا جلی میں نہ کام آئے جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ماہتاب میں



یہ سوءِ ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں  
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں  
گر وہ صدا سمانی ہے چنگ و رباب میں  
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں  
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں بیچ و تاب میں  
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں  
یاں کیا دھرا ہے قطرہ موج و حباب میں  
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں  
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں  
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کل کے لیے کر آج نہ حسرت شراب میں  
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند  
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع  
رد میں ہے رخسِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے  
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے  
اصلِ شہود و شاہد و مشہور ایک ہے  
ہے مشتمل نمودِ صور پر وجود بحر  
شرمِ اک ادا ہے ناز ہے اپنے ہی سے سہی  
آرایشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز  
ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

غالبِ ندیم دوست سے آتی ہے بوے دوست  
مشغولِ حق ہوں بندگی بو تراب میں



مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں  
ہراک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں  
اے کاش جانتا نہ ترے رنگور کو میں  
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں  
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں  
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں  
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیدادگر کو میں  
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں  
سمجھا ہوں دل پذیر، متاعِ ہنر کو میں

غالبِ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز  
دیکھوں علی بہادر عالی گھر کو میں



ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں  
وعدہ میر گلستاں ہے، خوش طالع شوق  
شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم  
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن  
حسرتِ اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی  
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں قیامت میں تمہیں  
ظلم کر ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو  
صاف دردی کش پیانہ جم ہیں ہم لوگ

غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں  
مژدہ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں  
لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں  
ہم کو تقلید تک ظرفی منصور نہیں  
عشق پر عربدہ کی گوں تن رنجور نہیں  
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں  
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں  
واے وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب  
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں



نالہ جز حسنِ طلب، اے ستم ایجاو نہیں  
عشق و مزدوریِ عشرت گہ خسرو، کیا خوب  
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم  
اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادثِ مکتب  
و اے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا  
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے  
سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں  
نفسی سے کرتی ہے اثباتِ تراوشِ گویا  
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت

ہے تقاضاے جفا، شکوہٴ بیداد نہیں  
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں  
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھریا د نہیں  
لطمہ موجِ کم از سیلی استاد نہیں  
جاننا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں  
گر چراغانِ سرِ رنگور باد نہیں  
مژدہ! اے مرغ، کہ گلزار میں صیاد نہیں  
دی ہے جاے دہن اس کو دم ایجاو نہیں  
یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب  
تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں؟





دونوں جہان دے دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا  
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں  
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے  
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں  
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم  
ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں



ہوگئی غیر کی شیریں بیانی کارگر  
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں



قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا  
تعب سے وہ بولا: ”یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟“  
دل نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب  
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں



دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا  
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی دادیاں  
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام  
مہر گردوں ہے چراغ رنگوار بادیاں



یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں  
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے  
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو  
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں  
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں  
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں

ہم اوجِ طالعِ لعل و گھر کو دیکھتے ہیں



نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں  
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے  
جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبانہ کہیں  
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں  
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب  
جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام!

شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں  
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں  
جو جاؤں واں سے کہیں تو خیر باد نہیں  
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں  
گداے کوچہٴ مے خانہ نامراد نہیں  
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب  
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں



تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں  
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ہم اک اپنی ہوا باندھتے ہیں  
تیری فرصت کے مقابل اے عمر برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں  
قید ہستی سے رہائی معلوم اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں  
نشہ رنگ سے ہے وا شد گل مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں  
غلطی ہائے مضامین مت پوچھ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں  
اہل تدبیر کی واماندگیاں! آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پرکار ہیں ، خوباں ، غالب  
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں



زمانہ سخت کم آزار ہے ، بہ جان آسَد  
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں





دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں  
کیوں گردشِ مدام سے گھبرانہ جائے دل  
یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے  
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے  
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے  
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ  
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے  
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں  
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں  
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں  
آخر گناہگار ہوں ، کافر نہیں ہوں میں  
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں  
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں  
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب وظیفہ خوار ہو ، دو شاہ کو دعا  
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں



خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں  
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں  
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں  
لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہو گئیں  
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہِ کنعاں ہو گئیں  
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں  
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں  
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں  
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں  
جو مری کوتاہی قسمت سے مرگاں ہو گئیں  
میری آپہں بخئیہ چاک گریباں ہو گئیں  
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں  
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں  
ماتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں  
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

سب کہاں، کچھ لالہ و گل نمایاں ہو گئیں  
یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزمِ آرائیاں  
تھیں بناتِ اعش گردوں، دن کو پردے میں نہاں  
قید میں یعقوب نے لی، گو نہ یوسف کی خبر  
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زناںِ مصر سے  
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق  
ان پری زادوں سے لیں گے غلد میں ہم انتقام  
نہند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں  
میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا  
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار  
بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے پے  
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب  
جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا  
ہم موجد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم  
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں  
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں  
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں  
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں  
ہوا ہے تارِ اشک یاں رشتہ چشم سوزن میں



یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں  
دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں  
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں  
طاقت بہ قدر لذت آزار بھی نہیں  
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں  
یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں  
آخر نوائے مرغ گرفتار بھی نہیں  
حالانکہ طاقتِ خلش خار بھی نہیں  
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیوانگی سے دوش پہ زنا رہی نہیں  
دل کو نیازِ حسرت دیدار کر چکے  
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے  
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یہاں  
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سروبال دوش  
گنجائشِ عداوت اغیار یک طرف  
ڈرنالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان  
دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روشی  
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا



نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں  
ہوئی ہے مانع ذوق تماشا خانہ ویرانی  
و دیعت خانہ بیداد کاوش ہائے مرگاں ہوں  
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی  
نکوہش مانع بے ربطی شور جنوں آئی  
ہوئے اس مہر ووش کے جلوہ تماشال کے آگے  
نہ نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے  
ہزاروں دل دیے جوش جنون عشق نے مجھ کو

ہوا ہے تارِ اشک یا س رشتہ چشم سوزن میں  
کف سیلاب باقی ہے بہ رنگ پنبہ روزن میں  
نگین نام شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں  
شب مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کی روزن میں  
ہوا ہے خندہ احباب بخیہ جیب و دامن میں  
پر افشاں جو ہر آئینے میں، مثل ذرۃ روزن میں  
جو گل ہوں تو ہوں گلخس میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں  
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

اسد زندانی تاثیر الفت ہائے خواباں ہوں  
خیم دست نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں



مزے جہان کے اپنی نظر خاک نہیں  
مگر، غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے  
یہ کس بہشت شاتل کی آمد آمد ہے  
بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا  
خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش  
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ  
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں  
وگر نہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں  
کہ غیر جلوۂ گل رنگور میں خاک نہیں  
اثر مرے نفس بے اثر میں خاک نہیں  
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں  
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے آسہ  
کھلا کے فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں



روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں  
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں  
آپ ہی ہوں نظارہ سوز پر دے میں منہ چھپائے کیوں  
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں  
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں  
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں  
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں  
جس کو ہودین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں  
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں  
جب وہ جمال دل فروز، صورت مہر نیم روز  
دشنہ، غمزہ جاں ستان، ناوک ناز بے پناہ  
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں  
حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بو الہوس کی شرم  
واں وہ غرور عز و ناز، یاں یہ حجاب پاس وضع  
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی!

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں  
رویئے زار زار کیا، کیجیے ہاے ہاے کیوں!



بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ مجھے بتا، کہ یوں!  
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ، یوں!  
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں!  
سامنے آن بیٹھنا اور دیہ دیکھنا کہ یوں!  
اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں،  
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں  
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں  
آسنہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ، یوں،  
موج، مہیٹ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں،

غنجہٴ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا، کہ یوں،  
پر شش طرز دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے  
رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے  
غیر سے رات کیا بنی، یہ جو کہا تو دیکھیے  
بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے  
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی  
مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح؟  
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی  
گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی؟

گفتہٴ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں،





حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو  
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو  
بہ قدر حسرت دل چاہیے ذوق معاصی بھی  
بھروں یک گوشہ دامن ، گر آب ہفت دریا ہو  
اگر وہ سرو قد ، گرم خرام ناز آ جاوے  
کف ہر خاک گلشن ، شکل قمری ، نالہ فرسا ہو



کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں  
طاعت میں تا، رہے، نہ سے وانگبین کی لاگ  
بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو؟  
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو  
ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو  
ہوں منحرف نہ کیوں رو و رسم ثواب سے

غالب کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے  
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو



وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو  
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا  
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیر کا گلہ  
پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا  
ڈالا نہ بکسی نے کسی سے معاملہ  
ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال  
ہنگامہ زبونی ہمت ہے انفعال  
وارستگی بہانہ بیگانگی نہیں  
مٹتا ہے فوتِ فرصت ہستی کا غم کوئی؟

کچے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو  
ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو  
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو  
یوں ہو تو چارہ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو  
اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو  
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو  
حاصل نہ کچے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو  
اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو  
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو، کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو



مرا ہونا برا کیا ہے نو اسنجان گلشن کو  
نہ دی ہوتی خدایا آرزوے دوست، دشمن کو  
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مٹرگان سوز کو  
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو  
نہیں دیکھا شناور، جوے خوں میں تیرے تو سن کو  
کیا بے تاب کان میں جنبش جوہر نے آہن کو  
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی برقی خرمن کو  
مرے بت خانے میں تو کبھے میں گاڑو برہمن کو  
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو  
رہا کھٹکا نہ چوی کو دعا دیتا ہوں رہن کو  
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو؟

قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جائیں میرے شیون کو  
نہیں گر ہمدی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے  
نہ نکا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحہ پر  
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں  
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں  
ہوا چہ چا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا  
خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سر بار ابر آوے  
وفاداری بشرط استواری، اصل ایماں ہے  
شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ جو مجھ کو  
نہ لنتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا  
سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جو یا ہوں جواہر کا؟

مرے شاہ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب  
فریدون و جم و کینخرو و داراب و بہمن کو



رکھتا ہے ضد سے، کھینچ کے باہر لگن سے پاؤ  
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹے گئے پیرزن کے پاؤ  
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤ  
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤ  
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن میں پاؤ  
اڑتے ہیں الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤ  
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤ

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤ  
دی سادگی سے جان، پڑوں کو ہلکن کے پاؤ  
بھاگے تھے ہم بہت، سوا سوا کی سز ہے یہ  
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور  
اللدرے ذوقِ دشتِ نور دی کے بعد مرگ  
ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف  
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں

غالب! مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو  
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤ



واں اس کو ہول دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار  
یعنی ، یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو  
اپنے کو دیکھتا نہیں ، ذوق ستم تو دیکھ  
آئینہ تا کہ دیدہٴ نچیر سے نہ ہو



صدرہ آہنگ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو  
کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو  
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو  
یہ نگاہِ غلطِ انداز تو سم ہے ہم کو  
نالہٴ مرغِ سحر تیخِ دو دم ہے ہم کو  
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو!  
پاس بے رونقی دیدہ اہم ہے ہم کو  
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

واں پہنچ کر جو غمش آتا ہے ہم ہے ہم کو  
دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے  
ضعف سے نقشِ پے مور ہے طوقِ گردن  
جان کر کے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو  
رشتکِ ہمِ طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں  
سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا  
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ، ولیکن ناچار  
تم وہ نازک کہ خموشی کو نغان کہتے ہو

## ق

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی ہوس سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

جادو رہ کشش کافِ کرم ہے ہم کو





تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو  
بچتے نہیں مواخذہ روزِ حشر سے  
کیا وہ بھی بہ گنہ کش و حق ناشناس ہیں  
ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار  
جب میکدہ چُھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید  
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست  
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو  
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو  
مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو  
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو  
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو  
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرور نہیں

دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو



گئی وہ بات کہ ہو گنگنلو تو کیونکر ہو  
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال  
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کچے  
تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا  
البتہ ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ  
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا  
ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر  
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا  
بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار

کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو؟  
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو  
حیا ہے اور یہی گوگو تو کیونکر ہو  
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو  
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو  
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو  
ہماری بات ہی پوچھیں نہ دو تو کیونکر ہو  
نہ مانے دیدۂ دیدار جو، تو کیونکر ہو  
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرد تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالبِ ولے بہ قول حضور  
”فراق یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو“



نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو  
سبک سربن کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو  
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو  
تو پھر، اے سنگدل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو  
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو  
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو  
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو  
ہوے تو دوست جس کے، دشمن اس کا آساں کیوں ہو  
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو  
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نراسخِ فغاں کیوں ہو  
وہ اپنی خو، نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں  
کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو  
وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا  
قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم  
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ  
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے؟  
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے  
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں  
کہا تم نے کہ کیوں غیر کے ملنے میں رسوائی

نکالا چاہتا ہ کام کیا طعنوں سے تو غالب  
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو



رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو  
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو  
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے  
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسہاں کوئی نہ ہو  
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ بیماردار  
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو



از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ  
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ



ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غمگدہ  
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ  
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے  
دشواری رہ و ستم ہمہاں نہ پوچھ



صد جلوہ رو بہ رو جو مڑگاں اٹھائیے      طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے  
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق      یعنی ، ہنوز منتِ طغلاں اٹھائیے  
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم      اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے  
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے  
یا پردہٴ تبسمِ پنہاں اٹھائیے



بھوں پاس آنکھ، قبلہ حاجات! چاہیے  
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے  
ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیے  
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے  
اک گونہ بخودی مجھے دن رات چاہیے  
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے  
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر  
دے داداے فلک دل حسرت پرست کی  
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوٰری  
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاء کو  
ہے رنگ لالہ و گل و نسرین جدا جدا



## ق

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بخودی      رو سوے قبلہ وقت مناجات چاہیے  
یعنی بہ حسب گردش پیمانہ صفات      عارف ہمیشہ مستِ مے ذات چاہیے  
نشوونما ہے اصل سے غالب فروع کو  
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے



بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی  
رہے اس شوخ سے آزر وہ ہم چندے تکلف سے  
خیال مرگ کب تسکین دل آزر وہ کو بخشے  
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہدم  
نہ اتنا بڑش تیغ جفا پر ناز فرماؤ  
مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجئے  
سورہتا ہے بہ اندازہ چکیدن سرنگوں وہ بھی  
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی  
مرے دام تمنا میں ہے اک صید زیوں وہ بھی  
کہ ہو گا باعثِ افزائش درد دروں وہ بھی  
مرے دریاے بے تابی میں ہے اک موج خوں وہ بی  
لیے بیٹھا ہے اک دوچار جام واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں  
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں ، وہ بھی



ہے بزم بتاں میں سخن آذردہ لبوں سے  
تنگ آئے ہے ہم، ایسے خوشامد طلبیوں سے  
ہے دورِ قدحِ وجہ پریشانی صہا  
یک بار لگا دو خم مے میرے لبوں سے  
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد  
زنہار نہ ہونا طرف اب بے ادبوں سے  
بیداؤِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر  
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے



تا، ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا  
سن لیتے ہیں ، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے  
غالب تر احوال سنا دیں گے ہم ان کو  
وہ سن کے بلا لیں ، یہ اجارہ نہیں کرتے



گھر میں تا کیا ، کہ ترا غم سے غارت کرتا  
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر ، سو ہے



غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی  
کھلے گا کس طرح مضمون مرے مکتوب کا یارب!  
لپٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے  
انہیں منظور اپنے زخموں کا دیکھ آنا تھا  
ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا  
لکد کو بھ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی  
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی  
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی  
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوز غم چھپانے کی  
اٹھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کو  
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی  
مری طاقت کو ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالب  
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی



حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھو ، اے آرزو خرامی  
دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی  
اس کی شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے  
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی